بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظرات

گزشتہ فروری کے آخری ہفتے میں متحدہ جمہوریہ عربیہ (مصر) کی "المجلس الاعلیٰ للشئون الاسلامیہ" کا ایک وفد جنوب مشرقی ایشیا کے ملکوں کا دورہ کرنے کے بعد راولپنڈی پہنچا۔ ادارہ تحقیقات اسلامی کی طرف سے اس کا استقبال کیا گیا۔ اور ادارہ کی دعوت پر پاکستان کونسل راولپنڈی میں المجلس الاعلیٰ کے وفد کے قائد نے تقریر کی، جس میں موصوف نے مجلس کی علمی، اشاعتی اور تبلیغی سرگرمیوں کا ذکر کیا۔ منجملہ اور کاموں کے انھوں نے بتایا کہ مجلس کے زیر اہتمام فقہ اسلامی کا ایک انسائیکلوپیڈیا مرتب کیا جا رہا ہے جو کہ فقہ اسلامی کے تمام شعبوں پر مشتمل ہوگا اور اس میں ملّت اسلامیہ کے پورے فقہی ورثے کو جمع کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ اس سلسلے میں انہوں نے کہا کہ ہم نے اس انسائیکلوپیڈیا میں فقہی مراجع کو صرف اہل سنت والجماعت کے چار مذاہب فقہ تک محدود نہیں رکھا، بلکہ اُن کے علاوہ زیدی، جعفری، اسماعیلی اور اباضی (خارجی) مذاہب فقہ کو بھی ان مراجع میں شامل کیا ہے۔

قاہرہ کی "المجلس الاعلیٰ للشئون الاسلامیہ" کے اس اقدام کی علمی و دینی حیثیت تو اپنی جگہ ہے ہی۔ یقیناً اس سے فقہ اسلامی کا دائرہ وسیع ہوگا۔ اس میں بحث ونظر کے دروازے کھلیں گے، مختلف مذاہب فقہ اور مکاتب فکر ایک دوسرے کی آراء اور مجتہدات سے واقف ہوں گے، اس طرح صدیوں کا ذہنی جمود ٹوٹے گا۔ ایک مخصوص مذہب فقہ بلکہ اس میں بھی ایک خاص مکتب فکر کی اندھی تقلید کے بندھن ڈھیلے پڑیں گے اور فقہی ذہن کو آزادی نصیب ہوگی۔

لیکن اس اقدام کی ایک اجتماعی، ملّی اور سیاسی (سیاسی اچھے اور تعمیری و تخلیقی معنوں میں) ضرورت بھی ہے۔ اور وہ شاید سب سے اشد اور اہم ہے۔ فرداً فرداً تمام مسلمان ملک اور اسی طرح پوری دنیائے اسلام آج جس دور سے گزر رہی ہے اور اسے اندرونی اور بیرونی طور پر جن مسائل اور خطرات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے، ان سے وہ صرف اس طرح ہی عہدہ برآ ہو سکتی ہے کہ مسلمان بجائے الگ الگ مذہبی فرقوں کے جن میں وہ صدیوں سے ذہناً و عملاً بٹے چلے آتے ہیں، ایک ملّت واحدہ

کی حیثیت سے سوچیں، محسوس کریں اور عمل پیرا ہوں۔ ایک ملک میں جو مسلمان بستے ہیں، وہ سب ایک دوسرے کو مسلمان سمجھیں اور ان کا کسی خاص فرقے سے متعلق ہونا زیادہ سے زیادہ ایک نجی معاملہ ہو، جو اُن کے اس ملک کی مسلمان قوم کے افراد بننے میں کسی طرح حارج نہ ہو۔ پھر ایک ملک کے مسلمان دوسرے ملکوں کے مسلمانوں کو بلا تمیز نسل، رنگ، قومیت اور مذہبی فرقے کے اپنا بھائی سمجھیں اور ان سب کو ملّت کا وسیع تر دائرہ ایک جذباتی، روحانی اور اجتماعی یگانگت و وحدت عطا کرے۔

ہمارے خیال میں فقہ اسلامی کی ترتیب و تدوینِ نو میں مسلمانوں کے تمام فرقوں کے مذاہب فقہ اور مکاتب فکر کو اصولاً ایک درجہ دینا اور اُن سب کو یکساں طور پر بحیثیت مراجع کے پیشِ نظر رکھنا، اس مقصد کے حصول کے لئے، جس کا اوپر ذکر ہوا، ایک ضروری قدم ہے اور اس سے آگے چل کر بڑے اچھے نتائج نکل سکتے ہیں۔

بے شک اسلامی فرقوں کی تاریخی حیثیت مسلّم ہے اور اُن کا معرضِ وجود میں آنا اور فروغ پانا وقت کی کوئی نہ کوئی ضرورت تھی، جو انہوں نے اپنے دَور میں پوری کی۔ یہ سب درست اور اس سے انکار کرنا حقائق سے منہ موڑنا ہے لیکن آج ہر مسلمان ملک کی ضرورتیں ہی ہیں، جو اس کی متقاضی ہیں کہ اس میں بسنے والے تمام مسلمان ایک متحد قوم بنیں اور ان کا مختلف فرقوں میں ہونا ان کی اس متحدہ اسلامی قومیت میں خلل انداز نہ ہو۔ اور وہ اس لئے کہ سب سے پہلے تو اس ملک کی دفاعی ضرورت اس کا مطالبہ کرتی ہے کہ ہر خارجی جارحیت کے مقابلے میں اس کے عوام ایک ہوں۔ اب اگر ایک فرقہ دوسرے فرقے کی تکفیر میں سرگرم ہوگا۔ اور اسے ہر وقت واصل بہ جہنم ہونے کی وعید سناتا رہے گا، تو خود ہی بتائیے کہ ان فرقوں سے تعلق رکھنے والوں کے دل کیسے جُڑے رہیں گے۔ اور وہ ایک دوسرے کے دکھ درد میں کس طرح شریک ہو سکتے ہیں۔ یہ منافرت دیر سویر ضرور رنگ لائے گی۔ اور ایک ہی ملک میں بسنے والوں میں منافرت پھیلے گی۔ ان حالات میں یہ توقع رکھنا کہ مسلمان "بنیان مرصوص" ہو کر خارجی دشمن کا مقابلہ کریں گے، محض خام خیالی ہے۔

"تکفیر" یعنی مسلمانوں کا ایک دوسرے کو کافر قرار دینا دینی اور اخلاقی لحاظ سے ہمیشہ سے مذموم رہا ہے۔ لیکن اس زمانے میں تو یہ اپنے ملک اور اپنی قوم سے صریحاً غداری کے مرادف ہے۔ کیونکہ اس سے خود ملک کا وجود خطرے میں پڑتا ہے۔ اور اس کے اندر تفرقہ و انتشار پیدا ہوتا ہے۔ جو اس کی سلامتی کے لئے سب سے بڑا خطرہ ہے۔

غرض "تکفیر" محض ایک دینی گمراہی نہیں، بلکہ وہ قومی و سیاسی جرم بھی ہے جس کا سدّباب ہر ملک کی مضبوطی کے لئے ضروری ہے۔ تمام مسلمان ملکوں میں اس کا احساس کیا جا رہا ہے۔ اور عوامی سطح پر اس کا چلن نہیں رہا۔ اور حکومتیں اس بارے میں خاصی چوکنّی ہیں۔

مزید برآں معاشی ترقی کے لئے جس کے تحت تعلیم، حفظانِ صحت، معاشرتی فلاح و بہبود، اجتماعی تنظیم

اور اس طرح کے اور بہت سے شعبے آتے ہیں، ضروری ہے کہ ایک قوم کے افراد میں کم سے کم مغائرت ہو۔ کیونکہ مغائرت خواہ وہ معاشی طبقات کی کشمکش کا نتیجہ ہو، یا مذہبی فرقوں کی باہمی مناقشت کا، صحت مند معاشی ترقی میں روک بنتی ہے اور اس کی وجہ سے عوام کی توجہ ملک و قوم کے حقیقی مفادات کے بجائے مخصوص گروہوں کی سرگرمیوں پر مبذول رہتی ہے اور وہ ایک متحد قوم بننے میں اس قدر سرگرم کار نہیں ہو سکتے، جس قدر اپنے مخصوص گروہ کو تقویت دینے میں۔

مسلمان ملک تمام کے تمام زندگی کے ہر شعبے میں دوسرے ملکوں سے بہت پیچھے رہ گئے ہیں، اور ان کی حالت یہ ہے کہ اگر وہ اپنا سب کچھ معاشی ترقی میں نہیں لگاتے اور جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا، آج معاشی ترقی، بدون زندگی کے دوسرے شعبوں کی ترقی کے ناممکن ہو گئی ہے، تو نہ صرف یہ کہ ان کے ہاں لوگوں کو روزگار نہیں ملیں گے اور وہ بھوکے مریں گے بلکہ ان کی آزادی بھی محفوظ نہیں رہے گی، اور انہیں کسی نہ کسی طرح اقتصادی امداد دینے والے بڑے ملک کا دبیل بن کر رہنا پڑے گا کیونکہ اس زمانے میں ایک ملک کی معاشی خودکفالتی ہی اس کے آزاد وجود کی سب سے بڑی ضمانت ہے اور بھوکا اور پس ماندہ ملک دوسروں کے اشارے پر چلنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

ملک کی معاشی ترقی کے لئے اپنا سب کچھ لگا دینا اس کے بغیر ممکن نہیں کہ قوم پوری طرح متحد ہو۔ دینی و جذباتی لحاظ سے بھی، اور ملک کے عمومی مصالح کے اعتبار سے بھی۔ لیکن اگر خدانخواستہ ایک ملک میں مذہبی فرقہ وارانہ مغائرت قائم رہتی ہے، اور اسے مساجد کے منبروں، مدارس کی مسندوں، جلسوں کی سٹیجوں، وعظ وارشاد کے خطبوں اور "دینی" رسائل کے صفحات کے مندرجات سے برابر ہوا دی جاتی ہے، جیسا کہ آج کل پاکستان میں ہے۔ تو کیسے باور کیا جا سکتا ہے کہ ہم ایک متحد قوم بن کر اپنا معاشی مقدر سنوار سکتے اور بے کاری، بھوک، پس ماندگی اور جہالت کو دور کر سکتے ہیں۔

جس قوم کے عوام کی ایک بڑی تعداد کی تعمیری و تخلیقی صلاحیتیں اور ان کی کمائی کا ایک معتدبہ حصہ ایسی مذہبی بحثوں اور فرقہ وارانہ مجادلوں میں صرف ہو، جن سے سوائے دلوں کے دکھنے اور دماغوں کے منتشر ہونے کے اور کچھ حاصل نہ ہو وہ قوم آج کی رزم گاہ حیات میں جہاں ایٹمی سرعت معیار کار بن رہا ہے، کیا کر پائے گی۔ یہ "مذہبی" سرگرمیاں وقت کا ضیاع نہیں، قوم کے جوہر حیات کا بھی ضیاع ہے۔

جہاں تک پوری ملتِ اسلامی کے باہم متحد و مربوط ہونے کی ضرورت کا سوال ہے، اس وقت دنیا جس طرح بڑے بڑے نظریاتی اور سیاسی بلاکوں میں منقسم ہے، اسے دیکھتے ہوئے اس سوال کی اہمیت کسی سے مخفی نہیں۔ روس کی کمیونزم ہو یا چین کی یا امریکہ اور برطانیہ کی سرمایہ دارانہ جمہوریت، یہ سب نظریات اور نظامہائے حیات کے زبردست سیلاب ہیں، جن کے سامنے کوئی چیز جب تک کہ وہ خود اپنی جگہ محکم نہ ہو، ٹھہر نہیں سکتی۔ عالم اسلام کو اگر اس ہمہ جہتی اور ہمہ گیر

سیلاب میں تہ آب نہیں ہونا، تو اسے اپنے نظریۂ حیات اور نظام حیات ہر دو میں اتنا ہی مضبوط و فعّال ہونا پڑے گا جتنی کہ یہ اوپر کی تحریکیں ہیں، اور ظاہر ہے متحارب و متخاصم فرقوں میں بٹا ہوا اسلام اور تقلید و جمود اور فکر و عمل کی تنگی کی زنجیروں میں مقید اسلام کا قانون ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

یہی احساس ہے، جو مصر اور دوسرے مسلمان ملکوں کو مجبور کر رہا ہے کہ علوم اسلامی کے اردگرد ماضی میں جو فرقہ وارانہ دیواریں بنا دی گئی ہیں، وہ ان کو ڈھائیں۔ اسلام کا مطالعہ جزوی نہیں، بلکہ کلی نقطہ نظر سے کریں، اور اس کے اصل سرچشموں تک پہنچ کر فرقوں کی موجودہ کثرت کو ایک بڑی وحدت کے اندر لے آئیں۔ آج کی دنیا میں اسلام بحیثیت ایک جاندار اور حرکت آفریں نظریہ حیات اور نظام حیات کے صرف اسی طرح اپنا مقام پیدا کر سکتا ہے۔

ہر مسلمان ملک کی طرح پاکستان کو بھی ان مسائل اور خطرات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے، بلکہ ہم تو یہ کہیں گے کہ اور مسلمان ملکوں سے کہیں زیادہ وہ ان کے نرغے میں ہے۔ اور یہ اس لئے کہ ایک تو تقدیر نے اسے ہندوستان جیسا ہمسایہ دیا، جو اس کے وجود کو ختم کرنے ہی کے درپے ہے۔ اور دوسرے ہمارے ہاں "مذہبی" جماعتوں کی جو نوعیت ہے، وہ جس طرح "ریاست کے اندر ریاست" نہیں، بلکہ "ریاست کے اوپر ریاست" ہونے کی دعویدار ہیں اور اپنے اس دعوے کو عوام اور حکومت دونوں سے منوانے کے لئے جو "مذہبی" سرگرمیاں انھوں نے پورے زور شور سے شروع کر رکھی ہیں، کسی دوسرے اسلامی ملک میں ایسا نہیں۔

ہم یہاں مثال کے طور پر دو اسلامی ملکوں کو لیتے ہیں۔ ایک مصر، جو ہمارے علماء کرام کے ایک حصّے کا ممدوح و مقصود ہے۔ اور دوسرا سعودی عرب، جسے علماء کرام کا دوسرا حصّہ اپنا آئیڈیل مانتا ہے۔ اب مصر میں ساری دینی تعلیم جامعۂ ازہر کے تابع ہے، جس کی براہ راست حکومت نگرانی کرتی ہے۔ نیز ساری مساجد، تمام وعظ و ارشاد کے سلسلے، افتا، اور دوسرے دینی مناصب وزارت اوقاف کی تحویل میں ہیں۔ اصولاً حکومت قوم کی مرضی کی ترجمان ہے اور یہ سب مناصب اور اُن کی سرگرمیاں حکومت کے تحت ہیں۔ علماء شریعت کے ناطق اور محافظین کہ حکومت کے اوپر اپنی حکومت منوانے پر اصرار کریں، اس کا وہاں کوئی تصوّر نہیں کر سکتا۔ اخوان المسلمین اسی حاکمیت کے مدعی تھے، ان کی ٹکر صدر ناصر سے پہلے کی حکومتوں سے بھی ہوئی اور صدر ناصر کی حکومت سے بھی ہوئی، اور اس کا جو افسوس ناک انجام ہوا، وہ سب نے دیکھا۔

اخوان المسلمین کی صدر ناصر اور جو اس سے پہلے تھے، ان کی حکومتوں سے ٹکر کی وجہ دراصل یہ تھی کہ اخوان المسلمین حکومت

پر شریعت کو مقدم قرار دیتے تھے۔ ان کے نزدیک حکومت کو شریعت کے تابع ہونا چاہیئے لیکن اس کے ساتھ ہی وہ اس پر بھی زور دیتے تھے کہ وہ شریعت کے ناطق ہیں چنانچہ حکومت کے جس قانون کو وہ غیر اسلامی کہیں، وہ مسترد سمجھا جائے اسی بناء پر اخوان مسلمین کا شاہ فاروق سے تصادم ہوا۔ وہ وفد پارٹی سے بھڑ گئے۔ اور آخر میں صدر ناصر کو اس الٹی میٹم کا سامنا کرنا پڑا۔ کوئی سیاسی ہیئت حاکمہ خواہ وہ کسی پارٹی کی ہو، کسی گروہ یا جماعت کی، خواہ وہ علماء ہی کی کیوں نہ ہو، اس طرح کی ماتحتی قبول نہیں کر سکتی۔ ان حالات میں تصادم ناگزیر ہو جاتا ہے۔

جہاں تک ہمیں معلوم ہے، کسی بھی مسلمان ملک میں "ریاست کے اوپر علماء کی ریاست" کے اس حق کو منوانے کے لئے اس طرح پروپیگنڈا نہیں ہوتا، جیسے پاکستان میں ہو رہا ہے۔ کچھ عرصہ ہوا، ایران میں جب عورتوں کو کچھ حقوق دیئے گئے، تو وہاں کے بعض مذہبی گروہوں نے اس میں مزاحمت کی اور حکومت کے اس اقدام کو خلاف اسلام بتا کر عوام کو بھڑکایا، جس کے نتیجہ میں بڑا خون خرابہ ہوا۔ لیکن یہ بات بہرحال واضح ہو گئی کہ حکم حکومت کا چلے گا، نہ کہ کسی خاص مذہبی گروہ کا۔

اسی طرح افغانستان میں بھی بعض لوگوں نے حکومت کے اس اقدام کی کہ عورتیں بغیر نقاب کے باہر نکل سکتی ہیں، مخالفت کی۔ اور یہ مخالفت مذہب کے نام سے کی گئی۔ اور وہاں بھی حکومت کو عملاً یہ ثابت کرنا پڑا کہ کوئی جماعت شریعت کی ناطق بن کر حکومت کے اوپر حاکم نہیں بن سکتی۔

خوش قسمتی سے سعودی عرب کی حکومت اور وہاں کے علماء میں پورا تعاون ہے، بلکہ شیخ محمدؒ بن عبدالوہاب کی اصلاحی تحریک کی سب سے قابل ذکر بات یہ ہے کہ خود انھوں نے اپنی دعوتِ اصلاح کے آغاز میں ہی "تقسیم عمل" کا مسلک اپنایا، چنانچہ دعوت کی سیاسی قیادت سعود خاندان کے سپرد کی گئی۔ اور اپنے لئے انھوں نے صرف دینی دعوت رکھی۔ تعاون عمل کی یہ اتنی درخشاں مثال ہے کہ اس کی جتنی تعریف کی جائے، کم ہے۔

سعودی عرب میں دینی تعلیم "آزاد" نہیں۔ نہ وعظ و ارشاد "آزاد" ہے اور نہ مذہبی تقریر و تحریر "آزاد" ہیں یعنی "آزاد" ان معنوں میں جو ہمارے مذہبی طبقوں میں مستعمل ہیں، انگریز کے دورِ حکومت میں تو ان باتوں کے آزاد ہونے یا ان کے آزاد رکھے جانے پر اصرار کے کچھ معنی تھے۔ لیکن ملک آزاد ہو گیا، اب یہاں کی ہیئت حاکمہ خود اہل ملک میں سے ہے، چاہیئے تو یہ تھا کہ جیسے دوسرے آزاد مسلمان ملکوں میں یہ سب باتیں وہاں کی قومی اسلامی حکومتوں کے انتظام و نگرانی کے تحت ہیں، اسی طرح یہاں بھی ہوں، لیکن ہمارے یہ بزرگ اب تک اُسی ذہنی ماحول میں رہ رہے ہیں، جو ۱۹۴۷ء سے پہلے تھا۔ اور بدلے ہوئے حالات کے مقتضیات پر غور کرنے کو تیار نہیں۔

پاکستان میں ایک طرح کا آج جو "مذہبی" بحران پایا جاتا ہے، اس کی حدود نہ زیادہ وسیع ہیں اور نہ زیادہ گہری۔ بے شک

مسجد اور دینی مدرسہ ہماری قومی زندگی کا بنیادی اور اہم عنصر ہیں۔ اور یقیناً ملک میں علماء کرام کی ایک کثیر تعداد ایسی ہے جو امامت، خطابت اور درس و تدریس کی خدمات بڑے خلوص اور للہیت سے انجام دے رہی ہے۔ بڑے افسوس کی بات یہ ہے کہ ان علماء کرام کی جو خاموشی سے اپنے دینی فرائض ادا کرتے ہیں، کسی حلقے سے، نہ صنعت کاروں اور دولت مندوں کے حلقے سے اور نہ حکومت کے اداروں سے سرپرستی ہوتی ہے۔ اور ان میں سے اکثر بڑی تکلیفیں اٹھا کر یہ خدمات انجام دیتے ہیں۔ پاکستان کی قومی زندگی کی تنظیم اور اس کی تشکیلِ نو میں اسلام کو ایک فعّال، مثبت اور مؤثر کردار ادا کرنا ہے۔ اور ملک کا کوئی حقیقی بہی خواہ یہ سوچ ہی نہیں سکتا کہ یہ کام علماء کرام کی مدد اور تعاون کے بغیر ہو سکتا ہے۔ دیہات میں، قصبات میں اور بڑے بڑے شہروں کے محلوں میں ائمہ، خطباء اور علماء حضرات عوام میں ایک نئی روح پیدا کر سکتے ہیں، جس کی محرک قوت بے شک دینی ہوگی، لیکن اس کا عملی اظہار اعمال و اخلاق کی اصلاح میں بھی ہوگا۔ اس سے معاشرہ بھی سدھرے گا۔ لوگوں کی کارکردگی بھی بڑھے گی۔ وہ زیادہ کام کریں گے، ملک کی پیداوار میں اضافہ ہوگا، قومی دولت بڑھے گی اور اس کے ساتھ ان سب چیزوں کا ملک کی سیاسیات پر بڑا اچھا اثر پڑے گا اور پاکستان صحیح معنوں میں ایک اسلامی مملکت کہلانے کا مستحق ہو سکے گا۔

دوسرے اسلامی ملکوں میں مساجد اور دینی مدارس کی سرپرستی وہاں کی اوقاف کی وزارتیں کرتی ہیں اور اس طرح ائمہ، خطباء اور مدرسین معاش سے ایک گونہ مطمئن ہو کر اپنے دینی فرائض ادا کرتے ہیں۔ کیا ہمارے ہاں کسی نہ کسی شکل میں ان حضرات کی امداد کا کوئی انتظام ہو سکتا ہے۔ یہ ایک مسئلہ ہے جو اربابِ اختیار کی توجہ کا مستحق ہے۔

باقی رہے وہ حضرات علماء، جو حقیقت میں موجودہ "مذہبی" بحران کے باعث اور محرک ہیں۔ اور باوجود کم تعداد میں ہونے کے، مادی ذرائع کی فراوانی نے انہیں نشر و اشاعت اور پبلسٹی کے وافر مواقع بہم پہنچا دیئے ہیں، ان کو ہم یوں تقسیم کر سکتے ہیں۔ ان میں سے ایک جماعت تو وہ ہے جو خالص سیاسی ہے اور مسندِ اقتدار پر قابض ہونا اس کی منزلِ مقصود ہے۔ گو بظاہر اس نے مذہب کا لبادہ اوڑھ رکھا ہے۔ اور سیاسی عزائم کو وہ مذہبی ناموں کے جامے میں پیش کرتی ہے لیکن اب اس کا یہ مذہبی پردہ چاک ہو چکا ہے۔ اور سب اسے ایک سیاسی جماعت سمجھتے ہیں۔ کاش یہ ممکن ہوتا کہ ہمارے ہاں ایسی مؤثر رائے عامہ موجود ہوتی، جو اس طرح کی دو عملی کے خلاف متحرک ہو سکتی تاکہ سیاسی اغراض کے لئے مذہب کو آلۂ کار بنانے والے عوام کے سامنے آنے کی جراءت نہ کر سکتے۔ ایک نہ ایک دن تو یہ ہونے والا ہے۔ مذہب زیادہ دیر تک سیاسی "طالع آزماؤں" کا کھلونا نہیں بنے گا۔ خدا کرے یہ جلد ہو۔

اس زمرے میں بعض ہمارے وہ بزرگ بھی ہیں، جو مذہبی جماعتیں بنا کر الیکشن لڑتے ہیں۔ ان کے نزدیک علماء کا کام

الیکشن لڑنا لڑانا ہے۔ الیکشن میں ہار بھی ہوتی ہے اور جیت بھی۔ سوء اتفاق سے ان میں سے بعض ہار گئے ہیں اور اب وہ ہر اُس ڈنڈے کو جس تک ان کا ہاتھ پہنچ جائے، حکومت کے خلاف چلانے کے لئے تیار رہتے ہیں۔ مثال کے طور پر ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی کی طرف سے "مجموعۂ قوانین اسلامی" کے نام سے ایک کتاب چھپی ہے، جس میں مؤلف نے نکاح و طلاق کے بارے میں اسلامی قانون کی دفعات کو جمع کیا ہے۔ اس میں "ایجادِ بندہ" کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ مؤلف کی نیت اور کام پر اعتراض ہو سکے۔ اس کتاب کی اُن حلقوں کے رسالوں نے بھی تعریف کی ہے، جو اصولاً ادارۂ تحقیقات اسلامی کے سخت مخالف ہیں۔ لیکن ہمارے یہ بزرگ جن کے نزدیک اصل دین اسمبلی کے الیکشن لڑنا ہے، اس کتاب کو بھی بطور ڈنڈے کے استعمال کر رہے ہیں کہ اس سے حکومت کی تواضع کریں۔ لطف یہ ہے کہ ان بزرگوں کی جمعیت کی شاخیں بغیر کتاب دیکھے اور پڑھے اُس کے خلاف قرار دادیں پاس کر رہی ہیں اور یہ قرار دادیں دھڑا دھڑ رسالے میں چھپتی ہیں۔

اس زمرے میں ہمارے وہ بزرگ بھی آتے ہیں، جن کی ہمارے دل میں بڑی عزت ہے۔ اُن کی ناراضگی سے ہمیں بڑا دکھ ہے۔ اور ہماری پوری کوشش ہے کہ وہ صورت حال کو سمجھیں اور دنیا جدھر جا رہی ہے اور اس کے ساتھ پاکستان کو بھی جدھر لازماً جانا ہے، وہ اس کا کچھ اندازہ کریں۔

یہ بزرگ بار بار فرماتے ہیں کہ پاکستان میں غالب اکثریت حنفیوں کی ہے۔ صدر ایوب کو چاہیئے کہ وہ اِدھر اُدھر کی بحثیں چھوڑ دے اور فی الفور حنفی فقہ کو ملک کا قانون بنا دے۔ اور ہائی کورٹ میں دوسرے ججوں کے ساتھ ایک حنفی جج مقرر کرے۔ ان بزرگوں کے نزدیک سارا اسلام حنفی فقہ میں محدود ہے۔ یہ زکوٰۃ کی فرضیت پر تو زور دیتے ہیں اور واقعی انہیں دینا چاہیئے، لیکن حکومت کے واجب الادا ٹیکس جن سے ملک کا پورا نظام چل رہا ہے، اُن کے نزدیک اُن کی ادائیگی چنداں اہم نہیں اور اس سلسلے میں انہیں فتویٰ دینے سے بھی تامّل نہیں ہوتا۔

یہ بزرگ اس دنیا میں رہتے ہیں، جس کا ان کے اِرد گرد کہیں وجود نہیں، لیکن اس کے باوجود وہ اصرار کرتے ہیں کہ اس خیالی دنیا کو حقیقت مانو۔ مثلاً ابھی زیادہ دن نہیں گزرے کہ ان بزرگ کے رسالے میں لکھا گیا تھا کہ یہ ٹیکس وغیرہ بالکل فضول چیزیں ہیں، مسلمانوں کی اتنی شاندار حکومتیں تھیں، جو ٹیکسوں کے بجائے فئے اور غنیمت پر چلتی تھیں۔

اس پر طرفہ تماشا یہ ہے کہ صدر ایوب کی حکومت کا کوئی علمی ادارہ ان بزرگوں سے تعاون کی درخواست کرے، تو یہ اسے مسترد کر دیتے ہیں۔ لیکن صدر ناصر کی حکومت کے ادارہ کی دعوت پر یہ بار بار قاہرہ جاتے ہیں۔ حالانکہ جہاں تک دونوں صدروں کی حکومتوں کا تعلق ہے۔ اُن میں کوئی زیادہ فرق نہیں، بلکہ صدر ناصر کی حکومت میں سیکولرزم اور سوشلزم کچھ زیادہ ہی ہے۔